عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ انہوں نے تیس برس کی عمر میں شادی کی ۔ اُن کی بیوی کا تعلق لاہور کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا ۔ چنانچہ ریٹائر ہونے پر وہ لاہور میں ہی بس گئے ۔ لاہور شہر اُنہیں پسند تھا ۔ ملازمت کے آخری سالوں میں انہوں نے بیرون لاہور مغلپورہ کے علاقے میں ایک مکان تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا ۔ مکمل ہونے پر اُس میں منتقل ہوگئے ۔ اُنہیں خُدا نے بیٹے کی نعمت سے محروم رکھا ، مگر دو خوبصورت اور صحتمند بیٹیاں عطا فرمائیں ۔ اُن کے گھر کا طور طریقہ گو روایتی تھا ، مگر تعلیم کی روشنی سے مُنوّر تھا ۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دِلوائی اور اپنے پاؤں پہ خود کھڑا ہونے کی تربیت دی ۔ بڑی لڑکی نے بی ۔ اے ۔ کیا اور مقامی سکول میں ملازمت اختیار کرلی ۔ دو چار سال میں اُس کی شادی ہوگئی اور دو بچوں کی ماں بننے کے بعد گھر گرہستن ہو کر بیٹھ گئی ۔ سلطان میر کی جیب سے مکان کی تعمیر اور بیٹی کی شادی پر عمر بھر کا جمع شدہ سرمایہ خرچ ہوگیا تھا ۔ چنانچہ اب اُن کی گزر اوقات صرف پنشن پر ہونے لگی ۔ ریٹائر ہونے پر اگر وہ کسی پرائیویٹ فرم میں نوکری کرنا چاہتے تو سابقہ تجربے کی بنا پر اچھی پوزیشن حاصل کر سکتے تھے ۔ مگر یہ بات اُن کے گوارِ خاطر نہ ہوئی ۔ خاندانی روایت کے مُطابق اُن کی طبیعت کا رجحان پڑھائی لکھائی کی جانب رہا ۔ سارا سارا دِن وہ قالین بچھے تختے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ، عینک ناک پہ رکھے ، عربی ، اور فارسی کے پُرانے پُرانے گمنام نسخوں کا مطالعہ اور ان کے تراجم کرتے رہتے ، اس اُمید پر کہ کبھی نہ کبھی کوئی اللہ کا بندہ ان پہ رقم خرچ کرکے ان کی نشرو اشاعت کا سبب بنے گا اور پھر خلقتِ خدا ان سے مستفیض ہو سکے گی ۔ نام پیدا کرنے کی خواہش اُن کے اندر مفقود تھی ۔ کہا کرتے تھے کہ اُن کا کام اگر کبھی لوگوں کے سامنے آیا تو نمبر ایک وہ ایک دھیلہ بھر معاوضہ نہ لیں گے ، اور نمبر دو یہ کہ اُن کا نام و پتہ کہیں درج نہ ہو گا ۔ فقط ایک گُمنام دو حرفی تخلص مُترجم کی حیثیت سے صفحۂ کتاب پر آئے گا ۔ اُن کی خصلت میں بے غرضی کی ایک رَو تھی جِس کے اندر زندگی گزارتے ہوئے وہ مکمل طور پہ مُطمئن تھے ۔ گھر میں اب سوائے میاں بیوی کے صرف ایک بیٹی ہی رہ گئی تھی ۔ رضیہ سلطانہ اُن کی چھوٹی بیٹی تھی ۔

رضیہ سلطانہ کی عمر گھر میں سب سے چھوٹی اور مزاج سب سے الگ تھا ۔ اُس کا قد درمیانہ ، رنگ سفید ، بدن دُبلا پتلا اور خمدار ، چہرہ گول جِس پہ فراخ ماتھا

2009/08/27 12:27

اور لمبی پلکوں والی چلبلاتی ہوئی آنکھیں تھیں جنہیں وہ ہر بات سے پہلے متعدد بار جھپکا کرتی تھی ۔ پُشت پہ سیاہ دراز بال کمر کے نیچے تک لٹکتے تھے ۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھی جن کے اندر ایک برقی رَو دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جس سے اُن کا بدن ہر لحظہ تھرکتا ہے اور حرکت ایک پل کو نہیں رُکتی ۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک آفت کا پرکالہ تھی ۔ وہ دھیمےپن جو اس کے خاندان والوں کا ایک وصف جانا جاتا تھا، رضیہ سلطانہ میں نام کو نہ تھا ۔ ہر بات میں اُسے شرارت سوجھتی تھی اور ہر چیز میں مذاق کا پہلو نکال لیتی ۔ گو ذہن کی تیز تھی مگر پڑھائی لکھائی سے زیادہ سرو کار نہ رکھتی تھی ۔

اِس کے بجائے وہ کھیل کُود ، بحث مباحثہ، تھیٹر ڈرامہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی ۔ ان باتوں کے علاوہ جو شے اُسے ایک بالکل الگ شخصیت عطا کرتی تھی وہ اُس کا خاص الخاص مزاج تھا ۔ وہ بے غرضی جو اُس کے باپ دادا کی خصلت کا ایک اہم جُزو تھی، رضیہ سلطانہ میں عنقاء تھی ۔ وہ ہر شے کو جانچنا، پرکھنا ، چکھنا ، حاصل کرنا اور قابو میں کر لینا چاہتی تھی ۔ اُس کے وطیرے میں ایک ایسی لپک تھی کہ جیسے وہ زندگی کے لحظے لحظے کو ہوا میں سے نوچ لینا چاہتی ہو ۔ اُس کے انگ انگ میں ایک ایسی حِرص تھی کہ جیسے دنیا کے عارضی ہونے کا عِلم اُس کے خون میں ہو اور وہ دُنیا کو تھام کر رکھنا چاہتی ہو ۔ جب وہ کالج میں گئی تو اسی وصف کی بنا پر سیدھی کالج کی سیاست کے عین بیچ میں جا ٹپکی ۔ گروپ بازی تو اُس کا مشغلہ تھا ہی ، سکول سے نِکل کر کالج کی کھلی سیاست میں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ گویا پیدا ہی اس مقصد کی خاطر ہوئی تھی ۔ دو سال کے اندر اندر وہ زنانہ سٹوڈنٹ لیگ کی عہدیدار بن گئی ۔ یہ وہ وقت تھا جب فیروز شاہ اور کرامت علی ، جِن کا کالج زنانہ کالج سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھا، اور جو رضیہ سلطانہ سے ایک سال پیچھے تھے، اپنے طور انہیں سرگرمیوں میں اُلجھوئے تھے ۔ اُنہوں نے اِس آدھے نقاب سے ڈھکے چہرے والی، لمبے سفید کُرتے کو لہرا لہرا کر دُھواں دھار تقریر کرتی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور دونوں اپنے اپنے دِل کے پیچھے گنوا بیٹھے ۔ گو شہر کے فیشن ایبل اور امیر لڑکے ، اور کالجوں کے مشہور کھلاڑی بھی رضیہ سلطانہ (جو رجّو میر کے نام سے مشہور تھی) کا دم بھرتے تھے، رضیہ کا ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایک جیسا تعلق تھا ۔ اب فیروز شاہ اور کرامت علی اِس میدان میں مقابلے پر اُترے ۔ آنے والے حالات کی روشنی میں کہا جا

2009/08/27 12:27

سکتا ہے کہ یہ اُن کا آخری مقابلہ قرار پایا =

دونوں نے بڑھ چڑھ کر سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا ۔ تقریروں اور مباحثوں ، جلسے جلوسوں ، لڑائی جھگڑوں ، عہدے بازی کی کشمکش کے ذریعے دونوں نے آگے آنے اور رضیہ کی نظروں میں چڑھنے کی کوشش کی ۔ آخر اِس کشمکش میں بھی فیروزشاہ کا پلّہ ہی بھاری رہا ۔ رضیہ کی طبعیت کا میلان فیروز شاہ کی جانب ہوتا گیا ۔ اِس میدان میں گو کہ آخری دم تک شہر کے دو ایک لڑکے موجود رہے ، مگر فیروزشاہ نے اس بے جگری سے اُس کا پیچھا کیا کہ آخر کار رضیہ کا دل جیت لیا ۔ کرامت علی، جِس کو اپنی دوستی ان سب باتوں سے زیادہ عزیز تھی، صُلح جُوئی کے ساتھ اِس صف آرائی سے ہٹ گیا ۔ مگر اس سارے قصّے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھائی میں تساہل کے باعث کرامت علی دوسرے سال کے سہ ماہی امتحان میں فیل ہوگیا ۔ چودہری برکت علی کو اس بات کا بہت رنج پہنچا، گو وہ منہ سے کچھ نہ بولے ۔ تاہم دو ایک ماہ مزید گزرنے پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جِس سے چوہدری برکت علی کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا ۔ سن سینتالیس کی گرمیوں کا موسم تھا ۔ مغربی پنجاب کے چھوٹے بڑے شہروں میں گرفتاریاں پیش کی جا رہی تھیں ۔ سکولوں کالجوں میں لمبی چُھٹیاں ہو چکی تھیں ۔ کرامت علی گاؤں جانے کی بجائے شہر میں ہی اپنے ایک دوست کے ہاں رُک گیا ۔ آخر آٹھ دس روز کی کوشش کے بعد گرفتاریاں پیش کرنے والوں کی فہرست پر کرامت علی اور فیروزشاہ کا نام چڑھا ۔ پُھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے ، ڈھول کی دھمک کے ساتھ ایک جُلوس کی شکل میں چار آدمی نعرے لگانے والوں کے ہجوم میں گِھرے شالا مار کے چوک میں پہنچے جہاں جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کی جا چکی تھی ۔ وہاں پہ پولیس پہلے سے موجود تھی ۔ اُنہوں نے چاروں کو گاڑی میں بٹھایا اور تھانے کے اندر لے گئے ۔ اُس روز فیروز شاہ اور کرامت علی کی ایک دِلی خواہش پوری ہوگئی =

گاؤں میں جب چوہدری برکت علی کو اس کی خبر پہنچی تو اُن پر گویا آفت ٹوٹ پڑی ۔ اُنہیں اِس بات کا گُمان تک نہ تھا کہ اُن کا بیٹا سیاست میں ملوّث ہے ۔ بیچارے سیدھے سادے شریف آدمی ، ایک بیٹے کی جان اُن کی زندگی کا سہارا تھی ۔ گرفتاری کی خبر سُن کر سخت گھبرا گئے ۔ اُن کا دل ڈوبنے لگا اور سر میں چکر آگیا ۔ وہ چارپائی پہ لیٹ گئے ۔ جب دل کچھ ٹھہرا تو اُٹھے ، گاؤں کے

2009/08/27 12:29

ایک باحیثیت زمیندار کو ساتھ لیا اور جاکر ضمانت پیش کردی ۔ کرامت علی نے لاکھ عُذر پیش کئے ، باپ کو سمجھایا بُجھایا، بتایا کہ یہ گرفتاری باعثِ شرم نہیں ، باعثِ افتخار ہے ، یہ قید عام قیدوں کی مانند جان پہ بن آنے والی نہیں بلکہ عیش و آرام میں گزر رہی ہے ۔ گپ شپ، کھانا پینا ، اُٹھنا بیٹھنا، میل ملاقات، سب سلسلے آسان ہیں، اور جلد ہی عزت داری سے اس کا انجام ہوگا ۔ مگر چوہدری برکت علی کا دل نہ مانا ۔ اُنہوں نے بیٹے کو اپنی پگڑی کا واسطہ دیا اور بضد رہے ، دھمکی دی کہ وہ وہیں حوالات کے دروازے پہ ڈیرہ جما کر بیٹھ جائیں گے اور اس گھڑی تک بھوکے پیاسے بیٹھے رہیں گے جب تک کہ کرامت علی قیدخانے سے اُن کے ہمراہ گھر کو نہ چل دے گا ۔ آخر کرامت علی کی اُن کے سامنے ایک نہ چلی ۔ اُدھر پولیس اور انتظامیہ والے ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کو تیار کھڑے تھے ۔ ضمانت قبول کرکے اُنہوں نے سارے کاغذات پہلے ہی چوہدری برکت علی، اُن کے ضامن ، اور کرامت علی کے ہاتھ میں دے دیے تھے ۔ چنانچہ اُسی روز شام کے وقت کرامت علی اپنے دوسرے ساتھیوں اور ملاقاتیوں سے گلے مل مل کر رُخصت ہوا ۔ اُن سب کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ دو روز پہلے جب وہ وہاں پہنچا تھا تو اپنے ہمراہ ایک دُنیا کو لے کر آیا تھا ۔ ڈھول کی تھاپ پہ ناچنے والوں اور خون کھولا دینے والے نعرے لگانے والوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اُسے کندھوں پہ اُٹھائے تھا ۔ آج وہاں سے تنہا نکلتے ہوئے اُسے محسوس ہو رہا تھا گویا واقعتاً وہ گُنہگار ہو اور رات کے اندھیرے میں جیل سے فرار ہو رہا ہو ۔ اُس کے دِل میں شرمساری اور ایک سُن کر دینے والی اُداسی کی کیفیت تھی ۔

گاؤں میں کرامت علی کا جی اُکھڑا اُکھڑا رہا ۔ چوہدری برکت علی نے ایک بار پھر اپنی سی کوشش کر دیکھی کہ اُن کا بیٹا کاشتکاری کی جانب متوجہ ہو اُن کے ساتھ شریک ہو کر گھر باہر کی ذمہ داری سنبھالے ۔ مگر کرامت علی کا دل گاؤں کی زندگی سے اُٹھ چکا تھا ۔ اُدھر فیروزشاہ کے قدم سیاست کے میدان میں جمتے جارہے تھے ۔ اُس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور شہر میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی ۔ پہلے وہ ایک دوست کے ہاں قیام پذیر رہا، بعد میں ایک دوکان کے چوبارے میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگا ۔ سیاست کے علاوہ اُس کا کوئی دھندا نہ تھا ۔ اُس کے باپ کی چند ایکڑ زمین تھی جس کی آمدنی سے کچھ حصہ اس کا باپ اپنا پیٹ کاٹ کر بیٹے کو دے دیتا تھا ۔ باقی اخراجات اُس کے

2009/08/27 12:29

دوستوں کی مدد امداد سے چلتے تھے ۔ فیروزشاہ اُن نادر جوانوں میں سے تھا جو قوم و وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور جن کے دِل میں سوا اس کے کوئی غرض نہیں ہوتی ۔ وہ وقت ہی ایسا تھا ۔ اس سرزمین نے اُس دور میں ایسے نوجوانوں کی ایک کھیپ پیدا کی جو بعد میں اسی زمانے کے ہاتھوں غرق ہوئے ۔ اُس پُر خطر دور کا ایک یہ بھی خاصہ تھا، کہ جس جوش جذبہ سے جوانوں نے ستاروں پہ کمند ڈالی ، زمانہ بدلا تو اسی کے زور نے اُنہیں برباد بھی کر ڈالا ۔ فیروزشاہ اُس وقت چڑھائی کی روش پہ تھا ۔ رضیہ سلطانہ ، جو برق صفت طبیعت کے باعث اپنی سفید پوشی کی زندگی کے نہ جانے کتنے چرکے کھائے بیٹھی تھی، اور جِس کی بدولت اس کا مزاج ایک ڈھب پہ اُستوار ہوتا چلا جا رہا تھا ، فیروزشاہ کی اسی بے غرضی کے سبب بُری طرح سے اپنا دل اُسے دے بیٹھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے ۔ رضیہ سلطانہ نے تعلیم ترک نہ کی ، مگر سیاسی سرگرمیوں میں بدستور فیروزشاہ کے پہلو بہ پہلو حِصّہ لیتی رہی ۔

کرامت علی کو ان سب باتوں کی برابر خبر ہوتی رہتی تھی ۔ گاؤں میں وہ گھر کے اندر ، یا کھیتوں میں پیڑوں کے تلے پڑا ستایا کرتا ، پھر ہر دوسرے چوتھے دن وہاں سے اُٹھ کر فیروزشاہ کو ملنے شہر چلا جاتا اور کبھی کبھار رات وہیں بسر کر کے آتا ۔ گو اُن کی زندگیوں نے اپنے اپنے رخ اختیار کر لئے تھے ، اُن کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ یہاں تک کہ رضیہ سلطانہ بھی، جو اپنی عام مقبولیت کے باوجود صرف چند ہی ذاتی دوست رکھتی تھی، اُسے اپنے قریبی ساتھیوں میں شمار کرنے لگی تھی اور ہر بات میں اُس کے صلاح مشورے کو اہمیت دیتی تھی ۔ صرف ایک بات تھی جِس کی خلش کرامت علی کو محسوس ہوتی رہتی تھی ۔ اُس نے آج تک رضیہ کی شکل نہ دیکھی تھی ۔ شروع دِن سے لے کر جب بھی اُن کا سامنا ہوا، خواہ مُختصر خواہ لمبی ملاقات ہوئی ، کرامت علی کے روبرو رضیہ سلطانہ کی وہی شکل و صورت رہی جو باقی دُنیا کی نظر میں آئی ۔۔۔۔۔ سیاہ یا ہلکے نیلے رنگ کے نقاب سے آدھا پونا جِسم اور ناک ہڈی تک کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا ، سر کے بال اسی نقاب کے سکارف تلے آدھے ماتھے تک بندھے ہوئے اس طرح کہ صرف اس کی آنکھیں اور ابرو، گالوں کی ہڈیوں تک رُخسار ، اور لمبی لمبی انگلیوں والے ہاتھ ہی نظر آتے اور یہاں پر اُس کی عریانی کی حد تک ختم ہو جاتی ، جیسے کہہ رہی ہو کہ بس، اس سے آگے کسی کا نہیں بنتا ۔۔۔۔۔ اس سے آگے ایک اسرار کا جہاں شروع ہوتا تھا جِس کی شیدگی

2009/08/27 12:30

ابھی تک، گو اب وہ رضیہ کا پیچھا کرنا ترک کر چکا تھا، بے پناہ کشش کی حامل تھی ۔ بس ایک تمنا اُس کے دل میں کبھی کبھار پیدا ہوتی تھی، کہ کاش وہ ایک بار اس عورت کا پورا چہرہ ہی دیکھ سکتا ، اُس کے اسرار کے امکان کا ایک نظر جائزہ ہی لے سکتا ۔ یہی بے سُود تمنا اُس کے دل میں کسی نہ کسی جگہ فیروزشاہ کے لئے حسد کا ایک بے معلوم سا جذبہ رکھنے کا باعث بھی تھی ۔ کبھی کبھار جب وہ گمان میں ہوتا تو اپنے آپ کو فیروزشاہ کی جگہ پہ پاتا اور پھر اس حالت میں وہ رضیہ سلطانہ کے پردوں کے زیر زیر رینگتا ہوا اُس کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش کرتا ۔ اس عالم میں وہ دیر تک کبھی اندھیرے اور کبھی روشن پردوں کے بیچ بیچ گھومتا رہتا اور جب نکلتا تو نیم سیر ہو چکا ہوتا ۔ اس کے باوجود جب بھی وہ فیروزشاہ اور رضیہ سے جاکر ملتا ، اس قسم کے خیالات اُس کے دل سے کوسوں دور ہوتے ۔ بیشک اُن دونوں سے کرامت علی کے تعلقات محض دوستانہ حد تک تھے، مگر اس بات کا بھی اسے علم ہو چلا تھا کہ دل کی باتوں کا ظاہر کی باتوں سے تعلق خال خال ہی ہوتا ہے ۔

اِنہی سرگرمیوں کے دوران فیروز شاہ نے دو ایک مزید عرصے جیل میں کاٹے ۔ جب پہلی بار کرامت علی ملاقات کی خاطر گیا تو فیروزشاہ بُہت خوشگوار موڈ میں تھا ۔ گپ شپ کے دوران مذاق کے طور پہ بولا، 'یار، تم نے پڑھائی تو چھوڑ ہی دی ہے ۔ کم از کم جیل میں ہی نوکری کرلو، اور کچھ نہیں تو ہم جیسے لوگوں کو کچھ سہولتیں ہی مل جایا کریں گی ۔ آج اخبار دیکھ رہا تھا، آسامیوں کا اشتہار بھی ہے'۔ کرامت علی سُن کر ہنس دیا ۔ لیکن اس بات نے، جو ظاہراً مذاق کی بات ہی تھی، اُس کے دِل میں ایک عجیب کُھد بُد پیدا کردی ۔ بار بار اُس کا دھیان اِس بات کی جانب جاتا اور اس کا خیال دِل میں گہرا ہی اُترتا جاتا ۔ جب سے چوہدری برکت علی اُسے زبردستی جیل سے نکلوا کر لائے تھے، کرامت علی کے دل میں ایک میخ گڑی تھی ۔ اُس کے ذہن سے یہ خلش نہ جاتی تھی کہ اپنے [illegible] کا ساتھ دینے میں وہ پورا نہیں اُترا ، کہ زندگی بسر کرنے میں اُس سے کوئی عظیم کوتاہی ہوئی ہے ۔ جِس بے لوث جرأت کا مظاہرہ فیروزشاہ اور رضیہ سلطانہ نے کیا ہے ، اُس قربانی کا وہ متحمل نہیں ہو سکا ۔ اُس کے اندر کوئی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ ایک چھوٹی سی شرمساری لئے لئے پھرتا تھا، جو ہردم اُسے [illegible] کا احساس دلاتی رہتی تھی ۔ اپنی ذات کے اِس نشیب سے نکلنے کی خاطر وہ لحظہ

2009/08/27 12:30

گویا اپنی اُنگلیوں کے ناخن دیوار میں گاڑے سر نکال کر اُوپر ہوا میں دیکھتا رہتا تھا ۔ جب فیروزشاہ نے مذاقاً اس بات کا ذکر کیا تو ایک لمحے کو یہ بات قطعی انہونی معلوم ہوئی ، پھر سیدھی اُس کے خیال میں جا اٹکی ۔ کیوں نہ جیل کی نوکری ہی کرلوں ؟ اُس نے سوچا ۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جس چیز نے اس خیال کو اکسایا تھا، وہ اس کے بالکل برخلاف جاتی تھی ، یعنی اُونچائی کو سر کرنے کی بجائے اُس نے مزید گہرائی کی جانب ہی راہِ فرار تلاش کرنے کی ٹھانی تھی ۔ انسان کی مختلف حرکات کے نشیب و فراز کی یہ بھی ایک عجیب کڑی تھی ۔

اگلے روز سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا وہ پچھلے روز کے اخبار کی تلاش تھا ۔ اخبار ہاتھ لگا تو اُس نے مذکورہ اشتہار پڑھا ، درخواست لکھ کر سندوں کی کاپیاں ساتھ نتھی کیں ، کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرکے ساتھ جوڑا ، اور سارے کاغذات مکمل کرنے کے بعد درخواست مشتہر پتے پر روانہ کردی ۔ جواب آتے آتے کئی ہفتے لگ گئے ۔ اس کے بعد امتحان کے لئے حاضر ہونے کا بلاوا آیا ۔ امتحان میں ایک لکھائی کا پرچہ ملا اور ایک زبانی سوال جواب کا امتحان دو شخصوں پر مبنی بورڈ کے سامنے منعقد ہوا ۔ امتحان ختم ہونے پر ایک بار پھر ہفتوں کی انتظار شروع ہوئی ۔ اس سارے دوران میں کرامت علی نے اُس بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا ۔ حسبِ دستور وہ ہر تیسرے چوتھے روز فیروزشاہ سے ملنے کے لئے جاتا، مگر فیروزشاہ کو اُس نے اس معاملے کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی ۔ کیوں اُس نے اس کا ذِکر نہ کیا؟ اس کی وجہ اتنی پیچیدگی کی حامل تھی کہ ٹھیک سے خود اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں غالباً اس بات کی شرم بھی مانع تھی کہ اب اُس نے زندگی کو پرانے دوستوں سے کاٹ کر بالکل مختلف ڈھب پہ چلانے کا انتخاب کر لیا تھا ۔ بہر حال، جب نوکری کے لئے منتخب ہونے کی اطلاع بذریعہ ڈاک موصول ہوئی تو پھر وہ زیادہ دیر تک صیغۂ راز میں نہ رکھ سکا ۔

چوہدری برکت علی کا ردِ عمل ملا جُلا تھا ۔ ایک طرف تو وہ ناخوش تھا کہ بیٹا کاشتکاری سے جاتا جاتا گاؤں سے ہی گیا ۔ ساتھ ہی ساتھ اُنہیں فخر اس کا بھی تھا کہ سیاست اور شہر کے دوسرے نکمے کاموں سے نکل کر کرامت علی سرکاری نوکری پہ جا کھڑا ہوا ہے ۔ باپ سے نبٹ کر کرامت علی فیروزشاہ سے ملنے گیا اور اب سارا راز اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا ۔ فیروزشاہ یہ خبر سُنتے ہی

2009/08/27 12:31

تو دنگ رہ گیا ، پھر اتنے زور سے ہنسا کہ ساتھ والے کمروں سے لوگوں نے جھانکنا شروع کر دیا ۔ کرامت علی کے دل میں جتنے بھی شکوک اسی بات کے بارے میں پیدا ہوئے تھے وہ سب فیروز شاہ کی پُر خلوص ہنسی سے غائب ہو گئے ۔ ٹھیک ہے' فیروز شاہ بولا ۔ گاؤں کی زندگی تو تمہیں راس آنے سے رہی، نوکری ہی کر کے دیکھ لو ہو سکتا ہے ایک دن بڑے افسر بن جاؤ ۔ اپنا ایک آدمی سرکاری افسر بھی ہونا چاہیئے ، ورنہ ہمارے کام کیسے چلیں گے؟۔

سب سے پہلا دھکا جو کرامت علی کو لگا وہ اُس کی تعیناتی کا تھا ۔ حالانکہ آسامی کے اشتہار میں اِس کی وضاحت تھی، اور زبانی امتحان میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ تعیناتی مُلک کے کسی حصے میں بھی ہو سکتی ہے ۔ مگر یہ بات اُس کے ذہن سے قطعی اُتر چکی تھی ۔ اُس کے خیال میں یہ بات کہیں سے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ لاہور یا زیادہ سے زیادہ گردونواح کے کسی جیل خانے میں جا کر لگے گا ۔ جب اُس کی تقرری کا خط آیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں اُس کو چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے حاضر ہونے کا حکم آیا تھا ۔ دو دن تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا ۔ کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ استعفٰے بھیج دے ، یا سرے سے حاضر ہی نہ ہو، پھر اِرادہ بدل دیا ۔ اُس نے سوچا کہ اتنی کوشش اور انتظار کے بعد اب کیا فائدہ ؟ چنانچہ مقررہ تاریخ پر سب سے مل مِلا کر کرامت علی اپنی ماں اور باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر گھر سے رُخصت ہوا ۔

اب کرامت علی کی شخصیت میں ایک اور تبدیلی رونما ہوئی ۔ ایک بار نوکری پر کھڑا ہو گیا تو آہستہ آہستہ اپنے مزاج کے اندر بدلنے لگا ۔ اُس نے دیکھا کہ جیل خانے کی نوکری فوج اور پولیس کی نوکری کی مانند چونکہ باوردی اور سپاہیانہ تھی، چنانچہ اس میں وہی ڈسپلن تھا ۔ اپنے سے نیچے والوں کے لئے حکم جاری کرتے ہوئے ، اور اُن کی تعمیل ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر اُس کو ڈسپلن بھانے لگا ۔ اپنے اختیارات کے دائرے میں جم کر بیٹھے ہوئے اُسے انوکھی طمانیت حاصل ہونے لگی ، یہاں تک کہ اُوپر والوں کے احکام بجا لاتے ہوئے بھی اُسے قوت اور سکون کا احساس ہوتا ۔ ہوتے ہوتے اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ نوکری کی کڑیوں کے اندر اختیار کی اصل طاقت حکم کے بجا لانے میں نہ کہ جاری کرنے میں ۔ اُوپر والے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے وہ، جوابدہی کی ذمہ داری سے آزاد ہو کر اپنے قول و فعل کا مالکِ کُل ہوتا ۔ اُسے پتا چلا کہ قوت

2009/08/27 12:31

کا سرچشمہ فرمانبرداری میں ہے ۔ نوکری کے اِن سلسلہ وار پردوں کے بیٹے جانے سے اُس کا دِل وہاں لگنا شروع ہوگیا۔

چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد کرامت علی کی تقرری راولپنڈی کے جیل خانے میں ہوگئی ۔ ہر دوسرے چوتھے مہینے وہ کسی نہ کسی طور سے چھٹی حاصل کر کے گاؤں آتا اور گھر والوں سے ملنے کے علاوہ فیروزشاہ سے بھی مل کر جاتا ۔ ڈیڑھ دو برس اسی طرح گزر گئے ۔ خوش قسمتی سے اُن کے گاؤں کے دو آدمی سرکار میں اعلیٰ رُتبے کو پہنچ گئے تھے ۔ ایک اُن کی اپنی ہی جاٹ برادری کے چوہدری غلام محمد ، ذیلدار کا بیٹا فضل محمد فوج میں بریگیڈیئر ہوگیا تھا، اور دوسرا سیدوں کا ایک لڑکا نبی احمد وزارتِ خزانہ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے کو جا پہنچا تھا ۔ ان دو اعلیٰ عہدیداروں کی وجہ سے گاؤں کی حالت کچھ سنورنا شروع ہوگئی تھی ۔ سرکاری کاموں میں 'منفی' دھاندلیوں کا امکان کم ہوگیا تھا، 'مثبت' دھاندلیوں کا امکان کچھ بڑھ گیا تھا ۔ افواہ تھی کہ پکی سڑک اور بجلی رکھوال میں آنے والی ہے ، اور گورنمنٹ کے ٹیوب ویل نسب کرنے کی سکیم بھی گاؤں تک بڑھادی جائے گی ۔ اس کے علاوہ سفارشی کاموں کا سلسلہ بڑھ چکا تھا ۔ چوہدری برکت علی نے بھی کہہ سُن کر دونوں افسروں تک بیٹے کی تعیناتی کے لئے سفارش چڑھادی تھی ۔ ایک مرتبہ تو کرامت علی چھٹی پر آیا ہوا تھا کہ سید نبی احمد ڈپٹی سیکرٹری بھی اتفاق سے رات کی رات کو گاؤں آئے ۔ کرامت علی نے باپ کے کہنے پر اپنی وردی پہنی اور اُسی وقت سید نبی احمد کے سامنے جا حاضر ہوا ۔ کس کر سلوٹ مارنے کے بعد اُس نے اپنی عرضداشت پیش کی ، جسے سُن کر نبی احمد نے ایک بار پھر اس کی مدد کا وعدہ کر لیا ۔ جب کبھی سید نبی احمد بریگیڈیئر فضل محمد کی مدد کے وعدے کی خبر کرامت علی تک پہنچتی ، اُسے ایک عجب سی خود اختیاری کا احساس ہوتا ۔ اور اُس کے اگلے چند ماہ اسی نشے میں گزر جاتے ۔

اُدھر فیروز شاہ سیاست میں بتدریج ترقی کرتا جارہا تھا ۔ اب وہ علاقے کی سطح تک پہنچ چکا تھا ، جس کی بدولت سرکاری دفتروں اور چھوٹے موٹے افسروں تک اُس کی رسائی تھی ۔ دِن دِن بھر غرضمندوں کو ساتھ لئے کچہریوں اور دفتروں میں اُن کے کام کرواتا پھرتا تھا ۔ ایک آدھ بار مزید حکومت کی مخالفت میں جیل کاٹ چکا تھا ۔ اِس کے باوجود خبر گرم تھی کہ اگلے الیکشنوں میں اُسے صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹ مل جائے گا ۔ رضیہ سلطانہ کے ساتھ اُس کا تعلق باقاعدہ قائم

2009/08/27 12:32

2009/08/27 12:32

تھا ۔ رضیہ سلطانہ نے بی ۔ اے ۔ کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول میں ملازمت کرلی تھی، مگر سیاست میں [illegible] بڑھ چڑھ کر حِصّہ لیتی رہی تھی ۔ اُس کا ارادہ تھا اگر اِن کاموں کی وجہ سے اُسے ملازمت سے نِکال دیا جاتا ہے تو وہ اپنا پرائیویٹ سکول کھول لے گی ۔ فیروز شاہ کا کہنا تھا کہ اِس معاملے میں وہ اپنا اثر و رسُوخ استعمال کر سکتا ہے ۔ اور کسی دِقّت کے پیش آنے کا احتمال نہیں ۔

فیروزشاہ کے والد احمد شاہ عام دیہاتی امام مسجدوں سے ہٹ کر واقع ہوئے تھے ۔ وہ اپنی پرہیز گاری اور مذہبی علم و فضل کی بنا پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور گاؤں کی زندگی میں اُن کی خاص اہمیت تھی ۔ پھر کبھی کبھار فیروزشاہ کی تصویر مقامی سیاست کے سلسلے میں اخبار میں آجاتی تھی، جس کی وجہ سے گاؤں کے حلقے میں اُن کی حیثیت اور بھی اہم ہوگئی تھی ۔ اِدھر کئی برس سے وہ فیروزشاہ کی شادی کرنے کی فکر میں تھے ۔ یوں تو سب ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے بیٹوں کی شادی رچائیں ۔ مگر احمد شاہ کی اس فکر میں ایک خاص وجہ کا دخل تھا ۔ وجہ یہ تھی کہ اُن کے خاندان میں سات پُشتوں سے اکلوتی اولاد ہوتی چلی آرہی تھی ۔ دادا پردادا کے اُوپر سے لے کر جہاں تک شجرۂ نسب کا کُنبے برادری والوں کو عِلم تھا، اِس گھر کی لڑی میں یہی نہیں کہ اکلوتی نرینہ اولاد ہوتی بلکہ سرے سے ایک اکلوتی اولاد ہی ملتی تھی اور اس کے بعد سلسلہ بند ۔ یہاں تک کہ اُن کے بڑے بڑوں نے، جو سب کے سب مذہبی علوم سے مالا مال تھے ، چار چار نکاح تک اسی کوشش میں کئے تھے کہ وافر اولاد کی دولت ملے، مگر خدا کی قدرت کہ ایک سے زاید اولاد کسی کے نصیب میں نہ ہوئی تھی ۔ اسی تقدیر کی بدولت اُن کے گھرانے کی قریبی رشتہ داری نہایت قلیل افراد پر مُشتمل تھی اور اسی سبب کے باعث اُن کے گھرانے کا رواج تھا کہ نو عمری میں ہی بچے کی شادی کی رسم پوری کردیا کرتے تھے ۔ اب اس پیڑھی پر آکر فیروز شاہ نے اپنے آپ کو اِس قدیم رواج سے مُستثنےٰ قرار دے دیا تھا ۔ اس بات کا احمد شاہ کو دِلی دُکھ تھا ۔ اُن کا کہنا تھا کہ عمر بھر میں اُنہوں نے اللہ تعالےٰ سے صرف ایک ہی دُعا مانگی تھی، کہ خُدا اُنہیں پوتا عطا فرمائے ۔ ایک عرصے سے وہ اسی کوشش میں تھے کہ اچھا سا رشتہ تلاش کرکے فیروزشاہ کا نکاح کردیں ۔ اِس سلسلے میں متعدد بار وہ شریف گھرانوں میں پیغام لے کر گئے اور راضی بہ رضا

2009/08/27 12:32

لوٹے تھے ۔ مگر فیروزشاہ تھا کہ کسی ڈھب پہ آتا ہی نہ تھا ۔ کبھی کسی بہانے کی آڑ لے لیتا کبھی کسی کی ، اور بعض [illegible] معاملہ [illegible] دیتا ۔ احمد شاہ اپنے بیٹے کے رویے پہ آخر ایسے متذبذب ہوئے کہ قوتِ ارادی ہی کھو بیٹھے اور چپکے ہو کر گھر میں بیٹھ رہے ، بس عبادت پہ سارا وقت صرف کرنے لگے اور دُعا مانگتے رہتے کہ خُدا اُن کے بیٹے کو ہدایت دے اور نسل افروزی کی جانب مائل کرے ۔ کبھی جب کرامت علی سے ملاقات ہو جاتی تو کمال درد سے التجا کرتے کہ وہ اپنے جگری دوست کو سمجھائے اور سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرے، اللہ اُسے جزا دے گا ۔ ایک روز کرامت علی نے آخر فیروز شاہ سے سوال پُوچھ ہی لیا، کہ وہ رضیہ سُلطانہ سے شادی کیوں نہیں کرلیتا ۔ جواب میں فیروزشاہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا ، پھر بولا 'کیا کروں ، عجیب عورت ہے' کرامت علی نے پوچھا ، 'کیا کہتی ہے؟' فیروزشاہ بولا 'شادی نہیں کرتی' ۔ کرامت علی حیرت زدہ ہو کر اُسے دیکھنے لگا ۔ 'کیوں نہیں کرتی؟' پھر اُس نے پوچھا ۔ 'کیا خبر' فیروزشاہ نے جواب دیا ۔ 'تم خود ہی اُس سے کیوں نہیں پُوچھ لیتے؟' کرامت علی کی سمجھ میں بات نہ آئی ۔ اُس روز جب وہ فیروزشاہ سے رُخصت ہونے لگا تو دِل میں ارادہ کرچکا تھا کہ رضیہ سُلطانہ سے یہ راز معلوم کرکے رہے گا ۔ افسوس کہ وقت نے اُسے مہلت نہ دی ۔ اُسے رضیہ سلطانہ سے پوچھنے کا موقعہ ہی نہ ملا، اور ایک وقت میں جاکر مِلا بھی تو اتنی دیر سے کہ پُوچھنے نہ پُوچھنے میں کوئی فرق نہ رہا ۔

صدی کی پانچویں دہائی کے اوائل تھے ، الیکشن کی خبریں زوروں پر تھیں ، کہ ہمارے ان چند کرداروں کے بیچ قدرت کی جانب سے چند ایسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں کہ اُوپر کا نیچے اور نیچے کا اُوپر ہوگیا ۔ ایک طرف تو چوہدری برکت علی کے گھر میں اُن کے بیٹے کے عقد کا چرچا چلا، ساتھ ہی سفارشوں نے اپنا کام دکھایا اور کرامت علی کی تقرری لاہور کے ایک جیل خانے میں ہوگئی ۔ اُدھر دوسرے دو گھرانوں میں کہرام مچ گیا ۔

ایک روز صبح سویرے فیروزشاہ اپنے چوبارے میں مُردہ پایا گیا ۔ اُس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا ۔ نعش پوسٹ مارٹم کے لئے گئی تو ڈاکٹر کسی دانستہ اور حتمی فیصلے پر نہ پہنچ سکے ۔ رپورٹ میں درج ہوا کہ موت حادثاتی طور پر اندرے سانس گھٹنے کی بنا پہ واقعہ ہوئی ہے، گو بدن پہ اس کے کوئی بیرونی نشان موجود نہ

تھے ۔ چنانچہ قانون کی رُو سے معاملہ یہاں پہ ختم ہوگیا ۔ فیروزشاہ کے دوست احباب نے ، پیروکاروں نے خون کے آنسو رو رو کر ماتم کئے ، ہزاروں طرح کی افواہیں اُڑیں ، دُشمنی اور حسد کو موجب قتل ٹھہرایا گیا ، ناکامیٔ عشق موردِ الزام قرار پائی، کثرتِ فکر کو دماغ کی نس پھٹنے کی وجہ بتائی گئی ۔ مگر نتیجہ آخر کار وہی نکلا ، کہ موت نے حسبِ دستور ایک جسم وجاں کے سارے معاملے سمیٹ کر دفن کر دیے تھے جبکہ وقت کا دور جاری و ساری تھا ۔ احمد شاہ بیٹے کی موت کے صدمے سے کچھ دیر کے لئے دماغی توازن کھو بیٹھے ۔ بات بات پہ آنکھ سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ۔ دھیان کی حالت یہ کہ بات کوئی اور ہوتی ، جواب کچھ اور ملتا ۔ کئی نمازوں کی امامت قضاء کردی ۔ مگر پھر جیسے جیسے وقت گزرا، عبادت کے ذریعے ، دُرود کے ورد سے ، وظیفے کی برکت سے حالت کچھ سُدھری ۔ اللہ کے نام میں قدرت کے کرشمے چُھپے ہوئے ہیں ۔ سلسلۂ نسل ونسب تو ختم ہوا، سلسلۂ حیات کو کون روکے ۔ احمد شاہ نے اپنی ذات کی منتقلی خدا کی ذات میں کردی ۔ آہستہ آہستہ وہ موقع آیا کہ احمد شاہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار رزق کے کچھ دانے منہ میں ڈالنے کو سر اُٹھاتے ، پھر تسبیح کے دانوں میں ، یا نماز کے استغراق میں کھو جاتے ۔

اُس طرف رضیہ سُلطانہ کے گھرانے پر قضا نے جھپٹا مارا ۔ اُس کی ماں میٹھی اللہ کو پیاری ہوگئیں ۔ پھر اُس کے باپ پہ فالج کا حملہ ہوگیا ، جس سے وہ بعد میں سنبھل تو گئے ، مگر دل اور دماغ پہ اثر زائل نہ ہوا ۔ یہ دو موتیں اور بیماری کا حملہ چند ہفتے کے اندر وقوع پذیر ہوئے ۔ رضیہ سلطانہ کی حالت کسی کے دیکھنے میں نہ آئی ، کیونکہ فیروزشاہ کی موت کے ساتھ ہی وہ ایک طرح سے رو پوش ہوگئی ۔ کرامت علی اُس کی ماں کی وفات کے موقع پر اُس کے گھر گیا، مگر رضیہ سلطانہ سے ملاقات نہ ہوسکی ۔ گھر پہ اُس کا بہنوئی عیادت کے لئے آنے والوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا ۔ کرامت علی تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا ۔ اس طرح کرامت علی کی زندگی کا ایک بُہت بڑا دور اپنے اختتام کو پہنچا ۔

وقت حسبِ دستور گزرتا گیا ۔ کرامت علی کی شادی ہوگئی اور وہ شہر کے ایک علاقے میں اپنی نوکری کے قریب کرائے کے مکان میں رہنے لگا ۔ اُس کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا جس کا نام اُس نے سلامت علی رکھا ۔ اِس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک پُر اسرار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ واقعہ ، یا اس کا سبب،

2009/08/27 12:33

کسی کے علم میں نہ آیا، محض اس کے نتائج دیکھنے میں آئے ، جو اصل واقعہ سے بھی زیادہ اسرار کے حامل تھے ۔ بہر حال ، جو کچھ دنیا کی نظروں کے سامنے پیش آیا ، اُس کا حال یوں ہے :۔

چند مہینے کے اندر کرامت علی نے نوکری سے استعفےٰ دے دیا اور بیوی بچے کو لے کر گاؤں لوٹ آیا ۔ چوہدری برکت علی کو، گاؤں کے دیگر لوگوں کی مانند ، کچھ مایوسی ہوئی کہ بیٹے نے سرکاری وردی اُتار پھینکی ہے ۔ مگر اُنہیں اِس بات سے سہارا ملا کہ شاید کرامت علی اب کاشتکاری کی جانب راغب ہو جائے ۔ وہ اب عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور کھیتی باڑی اُن کے بس کا کام نہیں رہا تھا ۔ آخری دموں پہ بھی اُنہوں نے اِس اُمید کو ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ اُن کا بیٹا اِس کام کو جاری رکھے گا اور گھرانے کی روزی کا بوجھ اپنے کندھوں پہ اُٹھائے گا ۔ مگر کرامت علی کا وطیرہ کچھ اور ہی شکل اختیار کر چکا تھا ۔ گاؤں کی طرف لوٹ کر کرامت علی کی زندگی جس ڈھب پہ چلنا شروع ہوئی وہ بالکل انوکھی تھی ۔

2009/08/27 12:33

باب سوئم

سلسلۂ کرامتیہ کی کہانی :۔

کرامت علی کے ساتھ قصہ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ شخص جس نے دین کی طرف کبھی سرسری دھیان بھی نہ دیا تھا، گاؤں لوٹتے ہی پکا دیندار ہوگیا ۔ پنج وقتی نماز ، وظیفہ ، تہجد، ڈاڑھی بڑھالی ، شرعی لباس ، ٹخنوں سے اُوپر تہمد، پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں ، مسجد میں کُل وقتی قیام، مسئلے مسائل ، غرضیکہ دین، کرامت علی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا ۔ چوہدری برکت علی کا دین سے بس اتنا ہی واسطہ تھا کہ وقت پہ نماز ادا کردی ، روزے رکھ لئے اور تہجد پڑھ لی ۔ اُن کے لئے گویا بیٹے کی جون ہی بدل گئی ۔ مگر کیا کرسکتے تھے، اللہ کے نام کے خلاف آواز بھی نہ اُٹھائی جا سکتی تھی ۔ نیز یہ کہ کرامت علی اب بچہ نہ تھا، خود ایک عدد بچے کا باپ تھا ۔ اگر خود کفالت سے دستبردار ہوگیا تھا تو یہ اُس کی اپنی دیکھ بھال کی بات تھی ۔ چوہدری برکت علی صبر و شکر کرکے چُپ ہورہے اور گرتے پڑتے اپنے اور بیٹے کے گھر کا رزق فراہم کرتے رہے ۔

کرامت علی کا ڈیرہ اب چوبیس گھنٹے مسجد میں تھا ۔ ہوتے ہوتے اُس نے امامت کے فرائض سنبھال لئے ۔ یہاں پر یہ ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ اس دوران میں مزید ایک واقعہ پیش آچکا تھا ۔ کرامت علی کے گاؤں لوٹنے سے کچھ ہی دیر پہلے احمد شاہ کا دماغی توازن بالآخر بگڑ گیا ۔ اُس شخص کے لیے یہ بھی ایک کارنامے سے کم نہ تھی کہ اُس نے اتنی دیر تک ہاتھ پاؤں مارے اور اتنا عرصہ

2009/08/27 12:33

خدا کی یاد میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا ۔ مگر آخر کار غم کے بوجھ تلے یاد اللہ کا بند بھی ٹوٹ گیا ۔ ایک روز وہ کسی کام سے شہر کو گیا اور وہاں سے فقیری کی حالت میں واہی تباہی بکتا ہوا لوٹا ۔ وہ دِن جاتا تھا کہ احمد شاہ نے مسجد کے اندر قدم دھرنا بند کر دیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے احمد شاہ پیش امام جس کی گاؤں بھر میں عزت تھی، ایک ایسے فقیر کی شکل میں بدل گیا جس کو نہ اوڑھنے بچھونے کی فکر نہ گھر باہر کی پرواہ ۔ سارا سارا دن گاؤں کی گلیوں اور کھیتوں میں آوارہ پھرتا ، ایسی ایسی باتیں بکتا رہتا جن کا کہ سر نہ پیر، اُلٹی سیدھی گردانیں کرتا، آنکھیں سُرخ کئے ہر آنے جانے والے کو کوستا، مارنے کو دوڑتا ، اور رات کے کسی وقت مسجد کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ جاتا ۔ کرامت علی جو رات بھر مسجد میں ہی گزارتا ، اُسے دیکھنے کو دروازے تک آتا ، مگر کبھی اُسے اندر آنے کو نہ کہتا، بس مسجد میں آیا ہوا کھانا سیڑھیوں پر رکھ کر چپکے سے لوٹ آتا ۔ احمد شاہ کبھی کھانا کھا لیتا ، کبھی چھوڑ دیتا، اور وہیں سیڑھیوں پر لیٹ جاتا ۔ کبھی کبھی وہ پیٹ کے بل لیٹ کر مسجد کی سیڑھیوں کو چُومنے لگتا ۔ کپڑے اُس کے جسم پر تار تار ہو کر لٹک گئے ۔ اُس کی چند ایکڑ زمین بے کاشت پڑی پڑی بنجر ہونے لگی ۔ اُس کی بیوی نے شرم کے مارے گھر میں مُنہ چھپالیا ۔ اور کچھ عرصے کے بعد اسی حالت میں جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی ۔ جب اُس کی لاش برآمد ہوئی تو اُس کی ہڈیاں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ فاقہ کشی سے مری ہے ۔ گاؤں کے لوگ احمد شاہ کو دیکھتے اور منہ پھیر لیتے ، جیسے اُس کے غم کی تاب نہ لا سکتے ہوں ۔ ہوتے ہوتے وہ فقیر جسے اپنی پہچان بھی نہ تھی ، موضع رکھوال کی خاص پہچان بن گیا ۔ ایک وہ وقت بھی آیا کہ گاؤں کے لوگوں نے احمد شاہ فقیر کی جانب توجہ دینا ہی چھوڑ دیا ، گویا وہ گاؤں کے سینے میں دفن کوئی ایسا راز ہو جس سے چشم پوشی لازمی ہو گئی ، سوائے ایک شخص کرامت علی کے ، جو چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ باجرے کی روٹی اُس کے آگے مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ کر واپس چلا آتا ۔ اور کبھی اُسے اندر داخل ہونے کی دعوت نہ دیتا ۔

کرامت علی کے طریق میں تبدیلی پہلی مرتبہ اُس وقت آئی جب اُس نے گاؤں کے ایک بچے کو دم کیا ۔ بچے کو دمے کا سخت دورہ پڑا ہوا تھا ۔ اُس کی سانس اُوپر کی اُوپر اور نیچے کی نیچے گلے میں پھنسی ہوئی تھی ، اور گاؤں کے دو حکیموں کی دواؤں اور تعویز دھاگے والے دوسرے لوگوں سے صحت کی کوئی

2009/08/27 12:34

صورت نہ نکل رہی تھی ۔ آخر ایک رات کو نا اُمیدی کی حالت میں عورت اُس نیم مُردہ بچے کو اُٹھائے مسجد کو لے آئی کہ اُس کے بچے کی رُوح پرواز کرے تو مسجد میں کرے ۔ مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے احمد شاہ فقیر نے گرج کر عورت کو گالی دی اور مارنے کو اُٹھا ۔ عورت نے روتے روتے ہاتھ باندھ لئے اور اُس سے بچتی بچاتی سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہو گئی ۔ مسجد کے اندر عورتوں کے داخلے پر قانوناً پابندی تو نہ تھی ، مگر چونکہ عورت کی پاکی ناپاکی کا پتا چلانا مُشکل کام ہے اور اُس کا اپنا بیان مستند نہیں ہوتا، اِس لئے وہ روایتاً مسجد میں داخل نہ ہوتی تھیں اور نہ ہی نماز باجماعت میں شریک ہو سکتی تھیں ۔ اُس رات کو وہ عورت اپنی بیقراری میں سب کچھ بھول گئی ۔ اُس نے بچہ لے جا کر کرامت علی کے آگے ڈال دیا ۔ کرامت علی نے نظر اُٹھائی تو حیران رہ گیا ۔ ایک تو عورت مسجد کے اندر کھڑی تھی ، دوسرے وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی اور کرامت علی کے سامنے سجدے پر سجدہ کئے جا رہی تھی ۔ کرامت علی کے چہرے پر ہراس کے نشان نمودار ہونے لگے ۔ اُس بلبلاتی ہوئی عورت سے پیچھا چھڑانے کے لئے اُس نے بے سوچے سمجھے اپنے سامنے پڑے ہوئے اُس حالتِ نزع والے بچے پر لمبی سی پھونک ماردی اور اُس کی طرف پُشت کر کے بیٹھ گیا ۔ عورت نے گڑگڑانا بند نہ کیا، بلکہ پہلو سے ہو کر دوبارہ کرامت علی کے سامنے آگئی اور اُس کے پاؤں کے آگے اپنا سر ٹیک دیا ۔ کرامت علی نے اُسے سجدے سے اُٹھانے کی کوشش کی ، مگر عورت کے سر کو ہلا نہ سکا ۔ پھر اُسے جو غضب آیا تو اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر ایک دو ہتڑ اتنے زور سے مسجد کے فرش پر مارا کہ زمین لرز گئی ۔ عورت کسی کل کی مانند سیدھی اُٹھ کر بیٹھ گئی ، اور ساتھ ہی گویا بچے کے گلے میں پھنسی ہوئی گانٹھ کھل گئی ۔ بچہ گھٹنوں اور پاؤں کے زور پہ اُٹھا اور کھڑا ہو گیا ۔ پھر اُس نے منہ کھولا اور پورے زور سے چِلّا چِلّا کر رونے لگا ۔ عورت نے بچے کی آواز نکلتی سُنی تو جھپٹا مار کر اُسے گود میں اُٹھایا اور ہنستی اور روتی ہوئی ، کرامت علی کو دعائیں دیتی ہوئی مسجد سے نکل گئی ۔ خُدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچے کو اس کے بعد ایک عرصے تک سانس کا دورہ نہ پڑا ۔ مگر اتنی دیر انتظار کرنے کی فرصت کسے تھی؟ اُسی روز کرامت علی کے دم کا چرچا گاؤں بھر میں پھیل گیا ۔

2009/08/27 12:34

اب کیا تھا۔ خلقت کا تانتا بندھ گیا۔ عورتیں بچوں کو، بوڑھوں کو، بیماروں کو
جن بھوت کے سائے والوں کو، بے انتہا بھاری بدن والوں اور سوکھے کے
مریضوں کو، حادثے کے شکار لوگوں اور اُن کو جن کی ہڈیاں ٹوٹ کر ٹیڑھی میڑھی
جُڑی تھیں، پیدائشی ناقص دماغ والوں کو اور سیدھے سادے بیوقوفوں کو
غرضیکہ ہر قسم کی علت رکھنے والے لوگوں کو لئے چلی آنے لگیں۔ یہاں تک کہ
کرامت علی کے پاس یادِ خُدا کا وقت کم ہوتے ہوتے صفر کے برابر رہ گیا۔ سارا
وقت اب اُس کا ان لوگوں کو دم کرنے میں صَرف ہوتا۔ ان لوگوں کو روکنے
کے لئے اُس نے کئی حیلے بہانے نکالنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر جہاں
پہلے وہ کوئی آیت وغیرہ پڑھ کر دم کرتا تھا، اب بغیر ہونٹ ہلائے یا کچھ پڑھے
پھونکوں پر پھونکیں لگانے لگا، اِس اُمید میں کہ یا تو دم ناکام ہو جائے گا، یا پھر
لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ پھونک دم پڑھنے کے بغیر لگائی جارہی ہے، لہذا اُن
کا ایمان اُٹھ جائے گا اور وہ آنے سے باز رہیں گے۔ پھر اُس نے لوگوں سے
درشتی کے ساتھ پیش آنا شروع کر دیا۔ مگر ان لوگوں کی آمد نہ رُکی۔ اُس نے
نمازیں ضائع کرنی شروع کر دیں۔ نماز کے وقت وہ جماعت سے الگ ہو کر سب
لوگوں کے سامنے باہر مسجد کی سیڑھیوں پہ (کبھی کبھی احمد شاہ فقیر کی معیت میں)
جا بیٹھتا جبکہ اندر نماز کسی کی امامت میں جاری رہتی۔ لوگوں کی موجودگی میں اُس
نے تسبیح پھیرنی بند کر دی تھی اور منہ بند کئے، سر اُوپر اُٹھائے چُپ بیٹھا رہتا
تھا۔ یہ سب حربے اُس نے ایک کے بعد ایک آزما کر دیکھ لئے تھے، مگر ان
میں سے کوئی ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ خدا کی قدرت ایسی کہ تقریباً ایک تہائی
سے زیادہ لوگوں پر دم کا اثر مُثبت پڑنے لگا اور ہر قسم کے عارضے اُس کی برکت
سے رفع ہونے لگے۔ غرض مند جوق در جوق آتے اور جاتے رہے۔ فیض حاصل
کرنے والوں کا میلہ لگا رہا۔

اپنے گاؤں سے باہر 'سائیں' کرامت علی کی شہرت پہلے پہل مزاروں کے
لنگر سے نکلی۔ اِس کا قصہ یُوں ہوا کہ فیض یافتگان کے ہجوم کے ساتھ ساتھ
مسجد میں کھانے کا شکرانہ لے کر آنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ گاؤں کے
فقیر شِکم پُری کے لئے آنے لگے۔ پھر دوسرے غریب لوگوں کے اپنے اپنے
کٹورے تھالے کھانے کا حصہ حاصل کرنے کو آنا شروع ہوئے۔ ہوتے ہوتے

2009/08/27 12:34

کھانے کی مقدار اس حد کو پہنچی کہ گاؤں کے حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد کھانا فالتو بچ رہتا۔ جو کرامت علی آوارہ کتوں، بلیوں اور ادھر اُدھر کے مویشیوں کو ڈال دیتا۔ جب گاؤں کی حدود کے باہر اس بات کی خبر پھیلی کہ رکھوال کے ساہیں کرامت علی کی مسجد میں لنگر چلاتے۔ چنانچہ آس پاس کے دیہات سے فقیر فقراء لنگر سے پیٹ بھرنے کو آنے لگے۔ بھوک مٹانے کے لئے آنے والوں کے ساتھ ساتھ اُن دیہات کے باحیثیت لوگوں میں بھی خبر عام ہوگئی کہ رکھوال کے ساہیں کرامت علی اسمِ با مسمّٰی کرامت ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہاں سے آنے والوں کا سفر بھی جاری ہوا۔ اسطرح باہر کے علاقے میں شہرت پھیل جانے سے کرامت علی کی اپنے موضع میں بھی عزت دوبالا ہوگئی۔ چنانچہ گاؤں کے تھوڑا بہت پڑھے لکھے اور غیر زمیندار لوگ، جو کرامت علی کو گھر کا لونڈا سمجھ کر خاطر میں نہ لاتے تھے، اب معتقد ہونا شروع ہوگئے۔

گو یہ لوگ پہلے پہل دم کروانے اور حاضری دینے کی حد تک نہ بڑھے، مگر نذر و نیاز کے معاملے میں بخل سے کام نہ لیا۔ روزانہ لنگر میں کھانا بنجوانے کے علاوہ جب کڑاہیوں کے موقعہ پر انہوں نے چنس کی بوریاں بھیجنی شروع کر دیں تو معاملہ مسجد کی حدود سے باہر جا نکلا۔ اب ضرورت یہ درپیش آئی کہ وہاں سے نکل کر ڈیرہ کسی اور جگہ پہ ڈالا جائے۔ چوہدری برکت علی نے جب یہ صورت دیکھی تو اپنی ذاتی زمین میں چار کنال کے رقبے کے گرد کچی دیوار کھڑی کر دی اور بیچ میں تین کمرے کھڑے کر دیئے۔ جب یہ ڈیرہ تیار ہوگیا تو کرامت علی اپنے پیروکاروں سمیت مسجد سے اٹھ کر وہاں جا رہا۔ یوں بھی مسجد میں اب اُس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ نماز چھٹ گئی تھی، ہاتھ میں صرف تسبیح رہ گئی تھی، جس کے دانوں کو وہ محض عادتاً گنتا رہتا تھا، مقصد کچھ بھی نہ رہ گیا تھا۔ نیاز سے اسمِ خدا کا ورد غائب ہوگیا تھا اور اس کی جگہ دم کی بے حساب فیسوں نے لے لی تھی۔ اپنا الگ ڈیرہ اب اُس کے مقصد کے لئے مناسب تھا۔

ڈیرے میں منتقل ہوتے ہی اُس کا نام ساہیں کرامت علی سے بدل کر ساہیں کرامت علی شاہ ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جیسے ہی اُس کا وقار میں قدرے اضافہ ہوا، اُس نے ساہیں کا لقب ترک کر دیا، اور ساتھیوں کو سختی سے ہدایت جاری کر دی کہ اسے استعمال نہ کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے اُس کی جگہ پر

2009/08/27 19:44

سُید لگانے کی سعی کی ، مگر کرامت علی شاہ نے کہہ دیا کہ وہ چوہان ہے ، آلِ رسول کیسے بن جائے ؟ لفظ شاہ اُس نے ایک اعزازی لقب کے طور پر نام کے ساتھ لگانے کی اجازت دے دے تھی ، لہٰذا یہ اضافت قائم رہی ۔ اپنے ذاتی ڈیرے کے قیام کے ساتھ ہی اُس کے عوامل میں وُسعت آنے لگی ۔ اب محض دم پھونک کی بجائے تعویز دھاگے کا استعمال بھی جاری ہوگیا ۔ جوڑوں کے دردوں کے لئے کلائی اور ٹخنے پر باندھنے کو دھاگا ، سِل اور دق کے مرض کے لئے چاندی کا کڑا ، نظرِ بد اور جِن کے سائے سے نکلنے کے واسطے تعویز ، بد رُوح سے بچاؤ کی خاطر عمل ۔ پھر فال کا نکالنا ، مقدمے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دُعا معہ تعویز ، محبوب کو زیر کرنے کے لئے وِرد ۔ اس کے بعد مثبت کی بجائے منفی حصُولِ خاطر ، یعنی دُشمن کو تباہ کرنے کے لئے گنڈے وغیرہ کی تجویز ۔ ان چیزوں کے ساتھ نذر نیاز کی قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا ۔ چُنانچہ جیسے لنگر کے بعد جِنس کی بوریاں وارد ہوئی تھیں ، اب اُن کے پیچھے کپڑے لتے ، ریشم کی چادریں ، برتن ، گھریلو سامان یعنی میزیں کُرسیاں ، رنگین پلنگ ، نِواڑ ، کاؤ تکیے ، دریاں قالین ، اور آخر میں پیسوں کی رقمیں آنے لگیں ۔ کسی نے بڑے کمرے کی چھت کے اُوپر ایک بانس گاڑ کر اُس کے سِرے پر سبز رنگ کا جھنڈا باندھ دیا ، جو اس مقام کے تقدس کا اشارہ بن گیا اِس طرح کرامت علی شاہ کے ڈیرے کا قیام عمل میں آیا ۔

کُچھ عرصہ اسی طرح گُذر جانے کے بعد ایک واقعہ پیش آیا جو اس مقام طریقت کی جڑیں ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کا موجب بنا ۔ دس کوس کے فاصلے پر موضع کچا کھوہ واقع تھا ۔ کچا کھوہ کو بڑا قصبہ نہ تھا ، مگر ایک تو لبِ سڑک ، اور دوسرے چوہان برادری کا اِس سارے علاقے میں مرکز تھا ۔ [illegible] کا ایک گھرانہ جس کا آڑھت کا کاروبار دارالخلافہ جیسے بڑے شہروں تک [illegible] ہوا تھا ، اس موضع کی تین چوتھائی زمین کے رقبے کا مالک تھا ۔ رکھوال اور [illegible] علی شاہ کی قسمت کا اول بدل اُس روز ہوا جب کچے کھوہ کے چوہانوں [illegible] بھائی ، اپنی ہی برادری کے ایک فرد کی شہرت سُن کر رکھوال آیا اور کرامت [illegible] شاہ کے رُوبرُو سوالی ہوا ۔ رحمت علی چوہان کا سوال کرامت علی شاہ کے لئے [illegible] سوال نہ تھا ، مگر ایسا سوال تھا جس پہ ہاتھ ڈالنے کی کرامت علی شاہ نے [illegible] ہمت نہ کی تھی ۔ یہ سوال اولاد اور بے اولادی کا تھا ۔ اس سوال پہ اس [illegible]

2009/08/27 19:45

کوئی دم پھونک ، تعویز یا عمل نہ کیا تھا ۔ اس سے کنی کترانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم تھے ۔ دوسری یہ کہ دین سے دُور ہونے کے باوجود کرامت علی شاہ کے دِل میں خوفِ خُدا کی رمق باقی تھی ، اور اُس کے خیال میں پیدائش اور موت دو چیزیں ایسی تھیں جو صِرف اللہ کے ہاتھ میں تھیں ۔ اُس کے دل میں وہم تھا کہ اگر اس نے ان دو معاملوں میں دخل اندازی کی تو اس کے ہاتھ سے باقی چیزوں کی قدرت بھی چھن جائے گی ۔ رحمت علی چوہان کے آگے اِسی وجہ سے اس نے انکار پہ انکار کیا ۔ مگر رحمت علی ارادے کا بہت پکّا نکلا ۔ وہ دنیا بھر میں گھوم پھر کے ، ڈاکٹروں سے لے کر بزرگوں تک کی حاضری دے کر مدد مانگ چکا تھا ۔ اب ، اس کے الفاظ میں ، یہ اُس کی آخری درگاہ تھی ، جہاں سے وہ نااُمید نہیں لوٹنا چاہتا تھا ۔ رحمت علی چار بھائیوں میں سب سے بڑا تھا ۔ اس نے بتایا کہ چوہانوں کے کاروبار کو اُسی نے شروع کیا تھا اور اسے مُلک گیر بنانے میں بڑا ہاتھ اسی کا تھا ، اور بد قسمتی دیکھئے کہ چاروں میں وہی ایک تھا جو اولاد سے محروم رہ گیا تھا ۔ رحمت علی نے کرامت علی شاہ کو آخر میں اپنی برادری کا واسطہ دیا اور کہا کہ وہ اپنے دل کی مُراد لئے بغیر وہاں سے نہیں ٹلے گا ۔ کرامت علی شاہ کی رحمت علی کے آگے پیش نہ گئی ۔ بادِلِ نخواستہ اُس نے مدد کا وعدہ کر لیا ، گو وعدہ اس نے صِرف پیشگوئی کا کیا ۔ اس نے رحمت علی سے کہا کہ وہ نہ تعویز دے گا نہ کوئی عمل کرے گا ، صرف استخارہ کر کے اسے بتا دے گا کہ اولاد کی نعمت اس کے نصیب میں تھی یا نہیں ۔ رحمت علی نے اس روز وہیں پہ ڈیرہ کیا ، اور کرامت علی شاہ نے اسی رات کو استخارے کا ارادہ باندھ لیا ۔ رات کے دوران اُسے اشارہ ملا کہ ایک نومولود بچہ ہے جو چلّا چلّا کر رو رہا ہے ۔ صُبح سویرے اٹھ کر اس نے رحمت علی کو یہ خوشنودی دی ۔ رحمت علی کے چہرے پہ بہار لوٹ آئی ۔ وہ نوٹوں کی [illegible] چڑھا کر خوشی سے اچھلتا ہوا گھر واپس لوٹا ۔ تین ہی ماہ گذرے تھے کہ [illegible] علی نے آکر کرامت علی شاہ کو اطلاع دی کہ اس کی بیوی کو حمل ٹھہر گیا ہے ۔ رحمت علی مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکروں ، ریشمی بستروں اور نوٹوں کی گ[illegible] سے لدا مزید ایک سوالی بن کر آیا تھا ۔ اب کے اس کا سوال تھا کہ دعا کی جائے اولادِ نرینہ ملے ۔ کرامت علی شاہ نے دعا کی ۔ رحمت علی کی پچیس سال کی [illegible] ہوئی جھولی بھری ہوئی تھی ، اس کے پیر زمین پہ نہ ٹکتے تھے ۔ اس کی واپسی [illegible] تھی

2009/08/27 19:45